علمِ بیان

تحریر وتقریر کی خوبیوں کے ذکر اور ان کی بحث کو علمِ بیان کہتے ہیں۔ علمِ بیان کی چار قسمیں ہیں: تشبیہ، استعارہ، مجازِ مرسل اور کنایہ۔

۱ تشبیہ

بنانے سنوارنے سے ہر چیز خوب صورت نظر آنے لگتی ہے۔ در و دیوار پر رنگ نہ ہو تو گھر بے رونق معلوم ہوتا ہے۔ سادہ تصویر کو رنگین کر دیا جائے تو قیمت بڑھ جاتی ہے۔ رنگین اور پھول دار کپڑے اسی لیے تو پسند کیے جاتے ہیں کہ ان میں بیل بوٹے اور طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔ نثر کے مقابلے میں نظم پسند کرنے کی وجہ لفظوں کا خوب صورت استعمال اور اس میں مختلف صنعتوں کا استعمال ہے۔ صنعت کاری گری کو کہتے ہیں اور صنائع جمع ہے۔ صنائعِ لفظی، الفاظ کی کاری گریاں اور صنائعِ معنوی، معنی و مفہوم کی کاری گریاں اور حسن پیدا کرنے والے طریقے جیسے: تشبیہ، استعارہ، مجازِ مرسل، کنایہ ایسی چیزیں ہیں جن سے عبارت میں آرائش کا کام لیا جاتا ہے۔ ان سے عبارت چمک اٹھتی ہے۔ فقروں میں حسن اور مضمون میں دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ اپنے روزمرہ میں ان سب چیزوں کو استعمال کرتے ہیں، لیکن انجان آدمی پہچانتا نہیں۔ گھر کی صفائی اور کمرے کی سفیدی دیکھ کر مختلف حضرات مختلف انداز میں تعریف کرتے ہیں۔

۱۔ گھر کس قدر صاف ہے، واہ وا، سفید براق نظر آتا ہے۔ ۲۔ کمرہ آئینے کی طرح سفید ہے۔

۳۔ کمرہ کیا ہے آئینہ ہے۔

تینوں جملوں کا مطلب ایک ہی ہے، مگر غور کرنے سے مطلب ادا کرنے اور خیال واضح کرنے میں کچھ فرق نظر آئے گا۔ الفاظ کی ترتیب اور معنوں کی ادائیگی میں پہلا جملہ سادہ اور صفت موصوف کی ترکیب سے مرکب ہے۔ دوسرے جملے میں تشبیہ اور تیسرے میں استعارہ، تشبیہ اور استعارے سے عبارت میں حسن پیدا ہوتا ہے اور مضمون میں جان پڑ جاتی ہے۔

زید حاتم کی طرح سخی ہے۔	بکر شیر جیسا بہادر ہے۔
شمیم طوطے کی مانند رٹتا ہے۔	مجید کوے کی طرح سیانا ہے۔

ان جملوں کو اگر یوں تقسیم کر دیا جائے تو کچھ باتیں زیادہ اچھے طریقے سے ذہن میں آجائیں گی۔

زید حاتم کی طرح سخی	بکر شیر جیسا بہادر
شمیم کا طوطے کی طرح رٹنا	مجید کوے کی طرح سیانا

زید کو حاتم، بکر کو شیر، شمیم کو طوطا اور مجید کو کوا کہا گیا ہے۔ زید بڑا سخی ہے اور حاتم بہت بڑا سخی تھا اور اس کی سخاوت بہت مشہور ہے۔ زید کی سخاوت سمجھانے یا اس کی بڑائی واضح کرنے کے لیے حاتم سے مشابہ بتایا گیا۔ اس عمل کو ''تشبیہ'' کہتے ہیں، یعنی کسی ایک چیز کو کسی مشترکہ خوبی یا برائی کی وجہ سے کسی دوسری چیز جیسا قرار دینا ''تشبیہ'' کہلاتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ ''سخاوت'' کی وجہ سے ''زید'' کو ''حاتم'' سے مشابہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح شیر بڑا دلیر اور بڑا بہادر ہوتا ہے' بکر کی بہادری کی تعریف میں اسے شیر کی مانند کہا گیا ہے۔

رٹنے میں طوطے اور سیان پن میں کوے کو شہرت اور امتیاز حاصل ہے۔ جب کسی طالب علم کی رٹنے کی صفت کو اجاگر کرنا ہو یا کسی کے سیان پن کی تصویر دکھانا ہو تو طوطے اور کوے کی مثال سے کام لیتے ہیں۔

ارکانِ تشبیہ:

(۱) مشبّہ (۲) مشبّہ بہٖ (۳) وجہِ شبہ (۴) حرفِ تشبیہ

مشبّہ: جسے تشبیہ دیں..... زید

مشبّہ بہٖ: جس سے تشبیہ دیں..... حاتم

وجہِ شبہ: وہ صفت جس کی بنا پر تشبیہ دی جائے۔ عام طور سے مشبہ بہ اس مخصوص صفت میں اتنا مشہور ہوتا ہے کہ سب کو معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے دوسری چیز یعنی مشبہ کو اس کے مانند بنا کر مشبہ کی ایک خاص صفت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

حرفِ تشبیہ: وہ کلمہ یا کلمے جو مشبہ اور مشبہ بہ کو ملائیں جیسے: مانند' جیسا' کی طرح' مثل ''بچہ چاند جیسا خوب صورت ہے'' اس فقرے میں:

بچّہ	مشبّہ	چاند	مشبّہ بہ	جیسا	حرفِ تشبیہ	خوب صورتی	وجہِ شبہ ہے

''کیا خوب صورت بچہ ہے' چہرہ چاند کی طرح گول اور چمک دار' گال گلاب جیسے سرخ' ہونٹ پنکھڑی کی مانند نازک۔''

ایک عبارت میں کئی مشبّہ اور مشبّہ بہٖ جمع ہو گئے ہیں۔

مشبّہ	وجہِ شبہ	مشبّہ بہٖ	حرفِ تشبیہ	مشبّہ	وجہِ شبہ	مشبّہ بہٖ	حرفِ تشبیہ
چہرہ	گولائی' چمک	چاند	کی طرح	گال	سرخی	گلاب	جیسے
ہونٹ	نزاکت	پنکھڑی	مانند				

میر کا شعر ہے:

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے سخت دل تنگ یُوسُفِؑ جاں ہے

اور علامہ اقبالؒ کا مصرع ہے:

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا

گھر کو زندان' جان کو یوسفؑ اور مسلمان کو نشتر کہنا تشبیہ ہے۔ گھر اور زندان میں وجہ شبہ تاریکی ہے اور جان کو یوسفؑ سے تشبیہ دینے کی وجہ قید میں دل کی تنگی ہے اور مسلمان کو نشتر سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ باطل کو کاٹ دیتا ہے۔

۲ استعارہ

استعارہ: لغت میں عاریتاً لینے اور کچھ دیر کے لیے اُدھار مانگ لینے کو کہتے ہیں یعنی ہم نے ذیل میں دی گئی مثالوں میں لفظ ''شیر'' کو ''حضرت عباسؑ'' کے لیے اور لفظ 'چاند' کو 'بیٹے' کے لیے عاریتاً لے لیا۔

تعریف: کسی ایک چیز کو کسی مشترکہ خوبی، برائی یا نقص کی وجہ سے بعینہٖ دوسری چیز قرار دے دینا 'استعارہ' کہلاتا ہے جیسے:

بہادر کو شیر۔ بزدل کو گیدڑ۔ شریر لڑکے کو شیطان کہنا۔ مثالیں:

۱۔ کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے ۔۔۔ رن ایک طرف، چرخِ کہن کانپ رہا ہے

۲۔ ماں کہتی ہے میرا چاند آیا۔

پہلی مثال میں جرأت وشجاعت کے باعث حضرت عباسؑ کو شیر کہا گیا ہے لیکن شعر میں ان کا ذکر نہیں۔ اسی طرح مثال میں ماں اپنے خوب صورت بیٹے کو چاند کہتی ہے اور بیٹے کا نام نہیں لیتی۔

سب جانتے ہیں کہ شیر ایک دلیر جانور کا نام ہے اور چاند ایک سیارہ ہے مگر ہم اصلی اور مجازی معنوں کا خیال کیے بغیر لفظ بعینہٖ دوسرے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

استعارہ کے ارکان: استعارے کے دو حصّے یا دو اطراف ہوتے ہیں۔ ایک مستعارلہٗ اور دوسرا مستعارمنہٗ۔ شریر لڑکا 'مستعارلہٗ' اور شیطان 'مستعارمنہٗ' ہے۔ استعارے میں مستعارلہٗ کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ یہی اس کا امتیاز ہے۔ اسی طرح ''مستعارلہٗ'' اور ''مستعارمنہٗ'' میں مشترک بات یعنی ''وجہ جامع'' (جسے تشبیہ میں وجہ شبہ کہتے ہیں) بھی بیان نہیں کرتے۔ اگر مستعارمنہٗ وجہ جامع اور حرفِ استعارہ جیسی چیز بیان کر دیں تو اسے تشبیہ کہیں گے۔

شعبِ صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں ۔۔۔ بُلبُل چہک رہا تھا ریاضِ رسولؐ میں

پہلے مصرعے میں' آواز کے اتار چڑھاؤ اور اس کے جوڑ کو پھول کی پنکھڑیوں سے تشبیہ دی ہے اور حرفِ تشبیہ ''جیسے'' موجود ہے۔ دوسرے مصرعے میں حضرت علی اکبر رضی اللہ عنہ کو 'بلبل'، اور مجمع اہلِ بیت علیہم السلام کو 'ریاض' (باغ) رسولؐ سے استعارہ کیا ہے۔

(الف) مستعارلہٗ: جس کے لیے استعارہ کیا جائے (تشبیہ میں اسے مشبہ کہتے ہیں) حضرت علی اکبرؑ جن کے لیے بلبل کا کلمہ استعمال ہوا ہے۔

(ب) مستعارمنہٗ: جس کا استعارہ کیا جائے (تشبیہ میں اسے مشبہ بہ کہتے ہیں) بلبل مستعارمنہٗ ہے۔

(ج) وجہ جامع: مستعارلہٗ اور مستعارمنہٗ میں پائی جانے والی مشترک خصوصیات۔

حضرت علی اکبرؑ کا اذان دینا اور بلبل کی خوش آوازی اور کشش ایک جیسی ہے۔

۳ مجازِ مرسل

تعریف: وہ لفظ جس کے مجازی معنی مراد ہوں مگر حقیقی اور مرادی معنوں میں تشبیہ کا تعلق نہ ہو۔

رستم سہراب کا باپ تھا۔ ۔۔۔ رستم نے لاہور میں انتقال کیا۔

چڑیا گھر میں شیر بھی ہے۔ شیر کا تیور دیکھا تو سب ڈر گئے۔

رستم: (۱) ایران کا پہلوان تھا' جوزال کا بیٹا اور سہراب کا باپ تھا۔ (۲) بہت بہادر آدمی۔ وہ بہادر جس کے مقابلے میں کوئی نہ ٹھہر سکے۔

شیر: (۱) ایک درندہ جانور جو سب جانوروں سے زیادہ بہادر اور خوف ناک ہوتا ہے۔ (۲) بہادر آدمی' نڈر انسان' رعب داب رکھنے والا۔

گدھا: (۱) مضبوط جفاکش بار بردار چوپایہ۔ (۲) بے وقوف آدمی' جاہل' کندۂ ناتراش۔

مذکورہ بالا لفظوں میں ہر لفظ کے دو معانی درج ہیں' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر لفظ کو شروع شروع میں صرف ایک معنی کے لیے استعمال کیا گیا۔ رفتہ رفتہ لوگ اسے دوسرے معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے۔ لفظ جب پہلے معنوں میں استعمال ہو تو یہ استعمال ''حقیقت'' کہلاتا ہے اور جب دوسرے معنوں میں استعمال ہو تو ''مجاز'' ہے۔

(۱) یونین کی صدارت تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ (۲) ہم آپ کی چشمِ عنایت کے محتاج ہیں۔

(۳) ایک گلاس ہمیں بھی دیجیے۔

ہاتھ :	جسم کا ایک جزو (حقیقی معنیٰ)	قدرت و امکان (مجازی معنیٰ)
چشم :	آنکھ (حقیقت)	توجّہ (مجاز)
گلاس :	ایک برتن کا نام (حقیقت)	پانی (مجاز)

کلمات کا یہ استعمال ''مجازِ مرسل'' ہے۔

چشمِ کرم - دستِ عنایت

کرم کی آنکھ اور عنایت کا ہاتھ نہیں ہوتا۔ نہ آنکھ اور ہاتھ کے ساتھ کرم یا عنایت کو تشبیہ دی جا سکتی ہے' مگر آنکھ سے توجہ اور ہاتھ سے سخاوت ہوتی ہے اور توجہ وصفت سخاوت سے احسان ہوتا ہے۔ اس سبب سے دونوں لفظوں کے مجازی معانی مراد لیے گئے ہیں۔ یونین کی صدارت تک ہاتھ نہیں پہنچتا۔ یہاں کل (ہاتھ) بول کر اس کا اثر یعنی قابو مراد لیا گیا ہے۔

ایک گلاس ہمیں بھی دیجیے ..... یہاں ظرف (گلاس) بول کر مظروف یعنی پانی مُراد لیا گیا ہے۔

پروفیسر سے ملیے ..... یہاں ایم۔اے کے طالب علم کو پروفیسر کہنا مستقبل کی امید کے تعلق سے ہے۔

تحصیل دار آئے تھے ..... ریٹائرڈ تحصیل دار کی آمد کی خبر دیتے ہوئے یہ جملہ عام ہے۔ مراد یہ ہے کہ ماضی میں جو تحصیل دار تھے وہ آئے تھے۔

مجازِ مرسل کے استعمال کی کئی صورتیں ہیں' کل بول کر جزو مراد لینا۔ جزو بول کر کل مراد لینا۔ مسبب کی جگہ سبب اور سبب کی جگہ مسبب بولنا۔ اسی طرح ظرف کی جگہ مظروف اور مظروف کی جگہ ظرف بولنا۔ مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

(الف) جزو کہ کر کل مراد لینا: مثلاً یہ کہیں کہ ''زندگی دو دن کی ہے'' زندگی کو فانی سمجھتے ہوئے دو دن کی کہا۔ زندگی طویل بھی ہو سکتی ہے سو سال کی بھی ہو سکتی ہے۔ اسے دو دن کی زندگی کہا گویا جزو کہ کر کل مراد لیا۔

(ب) کل کہ کر جزو مراد لینا: بچے کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر کہتے ہیں۔ ''' بیٹے! چھری رکھ دو کہیں ہاتھ نہ کٹ جائے۔'' ہاتھ تو نہیں کٹتا البتہ ہاتھ کے کسی حصے پر زخم لگ سکتا ہے۔ گویا کل کہ کر جزو مراد لیا۔ جب کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے دنیا دیکھی ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اس نے دنیا کا کچھ حصہ دیکھا ہے۔

(ج) سبب کہ کر نتیجہ مراد لینا: مثال کے طور پر یہ کہیں کہ بادل خوب برسا۔ یہاں بادل سبب ہے اس کا نتیجہ بارش ہے' کیوں کہ بادل نہیں برستا بلکہ بارش ہوتی ہے۔ گویا بادل کہ کر بارش مراد لی' یعنی سبب کہ کر مسبب یا نتیجہ مراد لیا۔

(د) مسبب کہ کر سبب مراد لینا: مثلاً یہ کہیں کہ ''آگ جل کر رہی۔'' آگ نہیں جلتی بلکہ لکڑی جلتی ہے۔ یہاں آگ مسبب ہے اور لکڑی سبب۔ گویا ذکر ہم نے آگ (مسبب) کا کیا اور مراد لکڑی (سبب) تھی۔

۴ کنایہ

کنایہ کے معانی ہیں اشارے سے بات کہنا اور کنایہ کی تعریف ہے: ''کسی لفظ سے ایسی بات مراد لینا جو اس کے معنوں کو لازم ہو۔'' مثلاً

شُترِ بے مہار: زبان دراز۔ بے ہودہ باتیں کرنے والا۔

پیٹ کا ہلکا: راز کی بات کہ دینے والا۔

''شُترِ بے مہار'' کا معنی ہے ''وہ اونٹ جس کی نکیل نہ ہو۔'' دوسرے مرکب کا معنی ہے ''پتلے اور ہلکے پیٹ والا آدمی'' لیکن جب ان کلمات سے ایسے معانی مراد لیے جائیں جو ان کے اصلی معنوں کے لیے لازمی یا صفاتی ہیں تو اس لفظ یا کلمے یا مرکب کو کنایہ کہیں گے۔ جب اونٹ کے نکیل نہ ہوگی تو لازماً وہ بلبلاتا پھرے گا۔ ہلکے پیٹ کی لازمی صفت یہ ہوگی کہ کوئی چیز اس میں نہ ٹھہرے گی۔ علمِ بیان کی یہ بہت اچھی صفت ہے جس سے بیان میں لطف پیدا ہوتا ہے اور بات واضح طور پر بیان بھی نہیں ہوتی۔

مرزا غالب کا شعر ہے:

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد　　　مے ہے' یہ مگس کی قے نہیں ہے

قدح : پیالہ' مراد شراب (مجازِ مرسل)

مگس : مکھی' شہد کی مکھی

مگس کی قے : شہد کے معنوں میں کنایہ

غالب کا ہی ایک شعر ہے:

صبح آیا جانبِ مشرق نظر　　　اک نگارِ آتشیں رخ' سر کھلا

دُوسرا مصرع آفتاب کے لیے کنایہ ہے' شاعر نے ایک چیز کے لیے بہت سی صفتیں بیان کر دی ہیں:

(۱) مشرق میں نظر آیا۔　(۲) صبح کا وقت۔　(۳) چہرہ گرم اور سرخ ہونا۔

(۴) سر جس پر کوئی پردہ نہ ہو اور بال کھلے اور پریشان ہوں۔ یہ کلیہ ہے کہ کنایہ ہمیشہ وضاحت کرنے سے زیادہ لطف دیتا ہے۔

صنائع بدائع

اصطلاح میں علمِ صنائع بدائع اُس علم کو کہتے ہیں جس سے تحسین وتزئین کلام کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔صنائع بدائع کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں سے چند کا ذکر ذیل کی سطور میں کیا جاتا ہے:

۱ تلمیح

کسی بات کو اچھی طرح سمجھانے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اسے کہانی یا گذشتہ سنے اور دیکھے ہوئے واقعے کے حوالے سے واضح کیا جائے۔ یہ وضاحت دو طرح سے ہوتی ہے۔ پہلے یہ سننے والے کو پورا قصہ سنایا جائے پھر اس سے موجودہ صورت حال کی مطابقت سمجھائی جائے۔اس کے بعد نتیجے کی یکسانیت پر روشنی ڈالی جائے یا دوسرے یہ کہ اس قصے کی جانب محض اشارہ کر دیا جائے اور نتیجے کی یکسانیت واضح کی جائے۔مثالیں:

(۱) حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اللہ کے بڑے بلند مرتبہ رسول تھے، لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے اور سچی راہ دکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ نمرود نے آپ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔لکڑیوں سے میدان بھر کر آگ لگوائی۔ جب لکڑی جل چکی اور انگارے دہکنے لگے تو بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک خاص اہتمام سے آگ میں پھینک دیا گیا۔لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے آگ ٹھنڈی ہوگئی اور اس میدان میں آگ کے بجائے چمن لہلہانے لگا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی تکلیف کے بغیر وہاں سے نکل آئے۔

اس واقعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کا عقیدہ پکا اور خدا پر بھروسا ہو، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان کو اپنے مقصد سے عشق اور خلوص ہو تو دنیا کی مصیبتوں کا کیا ذکر ہے آگ بھی گلزار بن سکتی ہے۔ہاں عشقِ صادق اور ارادہ پختہ نہ ہو تو آدمی ہمیشہ بحث مباحثہ اور دعوے دلیل ہی میں الجھا رہتا ہے کوئی کام نہیں کر سکتا۔

اس طویل عبارت اور لمبی چوڑی تقریر کو علامہ اقبالؒ نے دو مصرعوں میں لکھا اور مذکورہ بالا واقعہ بیان کیے بغیر واضح کر دیا:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق	عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

''آتشِ نمرود میں کودنا'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمال ایمان اور عشقِ الٰہی میں پختگی کے مشہور امتحان کی طرف اشارہ ہے۔واقعہ آپ نے پڑھا ہے اور سب کو معلوم ہے۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام اپنے والد کے بہت پیارے بیٹے تھے، یہ محبت بھائیوں کو ناپسند تھی۔ایک مرتبہ سب بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کے خلاف سازش کی اور انھیں سیر وتفریح کے بہانے گھر سے لے جا کر ایک کنویں میں ڈال دیا۔ واپس آئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام سے جھوٹ موٹ کہہ دیا: ''یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا۔'' حضرت یعقوبؑ یہ خبر سن کر نڈھال ہو گئے، مدتوں روتے رہے، گھر اجڑ گیا۔ادھر حضرت یوسف علیہ السلام بے حد مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔غلام بنائے گئے، بازار میں بیچے گئے، قید و بند میں رہے۔

اسی طرح کی مصیبتیں حامد پر گزر رہی ہیں۔عزیزوں اور بھائیوں نے جینا دوبھر کر دیا ہے۔اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے:

''حامد بھرے پُرے خاندان کا آدمی ہے مگر وہ سب برادرانِ یوسفؑ ہیں۔'' اس حُسنِ بیان اور خوب صورتی کا نام تلمیح ہے۔

تلمیح: نظم ونثر میں ایک لفظ یا چند مختصر الفاظ کے ذریعے سے کسی مشہور آیت، روایت، واقعے یا تاریخی سانحے کی طرف اشارہ کرنا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب	آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

کوہِ طور: وہ پہاڑ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے کلام کرتے تھے۔ایک دن آپ نے امت کے کہنے سے اللہ کے حضور درخواست کی کہ مجھے اپنا دیدار عطا فرمائیے۔جواب ملا ''لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانه فسوف ترانی'' (تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے' لیکن پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہ گیا تو پھر دیکھ سکو گے) اس کے بعد ایک چمک ہوئی' پہاڑ سرمہ ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔قرآن مجید میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔اردو میں بہت سی تلمیحوں کے حوالے سے: ارنی۔لن ترانی۔ کوہِ طُور۔تجلّی۔تجلّی کی تاب نہ لانا۔طُورِ سینا۔مناجاتِ موسیٰ علیہ السلام۔آرزوئے دیدار۔برقِ طُور وغیرہ تلمیحات اسی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ابنِ مریمؑ ہوا کرے کوئی   میرے دکھ کی دوا کرے کوئی   (غالبؔ)

عیسیٰ علیہ السلام' بیماروں کو چھو لیتے تو مرض جاتا رہتا تھا' مردے کو ''قُم بِاذنِ اللہ'' (اللہ کے حکم سے اٹھ بیٹھ) فرمایا تو مردہ زندہ ہو گیا۔ اس بات کے لیے بہت سی تلمیحیں استعمال ہوتی ہیں۔عیسیٰ نفس۔دمِ عیسیٰ۔اعجازِ مسیحا۔

اِک کھیل ہے ''اورنگِ سلیمان'' مِرے نزدیک   اِک بات ہے ''اعجازِ مسیحا'' مِرے آگے

اورنگِ سلیمانؑ: حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے محبوب نبی تھے۔آب و ہوا' جن و بشر' خشک و تر کی بادشاہت ملی ہوئی تھی' پرندوں کی بات سمجھتے اور جنات پر حکومت کرتے تھے۔آپ کا تخت (اورنگ) ہوا لے کر چلتی تھی۔آپ کے پاس ایک انگوٹھی تھی اور انگوٹھی میں ایک نقش تھا جس کے اثر سے جن و پری آپ کے فرماں بردار تھے۔حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق یہ تلمیحات ہیں۔

نقشِ سلیمانؑ۔تختِ سلیمانؑ۔ہدیہ مُورِ سلیمانؑ۔چیونٹی اور سلیمانؑ۔بلقیس و سلیمانؑ۔ہُدہُد اور سلیمانؑ۔

آبِ حیات: (آبِ حیوان' چشمۂ حیواں' آبِ بقا) کہتے ہیں کہ طویل اور تاریک راستے کے بعد ایک چشمہ ہے جس کا پانی پینے والا کبھی نہیں مرتا۔ایک مرتبہ حضرت خضر علیہ السلام سے سکندر نے وہاں جانے کی خواہش کی۔آپ نے فرمایا' میں تجھے وہاں لیے تو چلتا ہوں لیکن کچھ شرطیں ہیں۔سکندر نے شرطیں مان لیں' لیکن جب ظلمات میں داخل ہوا تو ہمت ہار گیا اور راستے ہی سے واپس آ گیا۔حضرت خضر نے چشمے پر پہنچ کر پانی پیا۔ اس لیے خضر و سکندر کا ذکر راہنمائی' سکندر کا چشمۂ آبِ حیات سے پیاسا پلٹنا وغیرہ کو تلمیحات کی حیثیت حاصل ہے۔

صبرِ ایوبؑ۔نالۂ یعقوبؑ۔نغمۂ داؤدؑ۔ملکِ سلیمان جیسی بے شمار تلمیحیں گذشتہ پیغمبروں اور پرانی اُمتوں کے واقعات سے متعلق رائج ہیں۔

خیبر شکن: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خیبر کی جنگ میں یہودیوں کے قلعے قموس کو فتح کیا اور قلعے کا بہت بھاری دروازہ توڑا اور اپنے ہاتھ سے اٹھا کر پھینک دیا۔اس جنگ میں مرحب و عنتر نامی بہادروں کو تلوار سے قتل کیا۔علامہ اقبالؒ کے ذیل کے شعر میں مرحبؔ' عنترؔ' حیدری جیسی تلمیحات سے مذکورہ حقائق مراد ہیں۔

؎ نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے   وہی فطرتِ اسد اللّٰہی' وہی مرحبیؔ' وہی عنتری

کربلا' ذبحِ عظیم: امام حسینؓ دس محرم ۶۱ھ کو کربلا نامی میدان میں یزید کے حکم سے شہید کر دیے گئے۔اس واقعے سے تعلق رکھنے والی بہت سی تلمیحات اردو میں استعمال ہوئی ہیں۔مثلاً شاہِ شہیداں' شامِ غریباں' صبحِ عاشور وغیرہ۔

گنج بخش: جناب سید علی ہجویریؒ کی کرامت اور گنج شکر بابا فریدالدینؒ کی کرامت وعطا کی تلمیح ہے۔

مذہبی تلمیحات کے علاوہ لیلیٰ' مجنوں۔شیریں' فرہاد۔سسی' پنوں۔ہیر رانجھا۔محمود و ایاز۔مانی و بہزاد۔لنکا ڈھانا۔ہفت خواں رستم۔

جامِ جمشید۔ تیشہ وفرہاد۔ آئینۂ سکندری۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ ٹیڑھی کھیر۔ جون پور کا قاضی بھی تلمیحات کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

۲ صنعتِ تضاد

دھوپ اور چھاؤں، چاندنی اور اندھیرا، سیاہ اور سفید کو یکجا دیکھیے کیا لطف نظر آتا ہے! اسی طرح لفظوں اور معنوں کو ربط دیا جائے تو عبارت رنگین اور شعر خوب صورت ہو جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد شہاب الدین غوری کی فوجی گشت کے سواروں کے گرفتار کردہ چند گھسیاروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سب کے سب جنگلی گنوار تھے، مگر دو بڑھے ہوشیار اور تجربے کار نکلے۔'' چھوٹے سے جملے میں ''جنگلی گنوار اور ہوشیار، تجربے کار'' کے لطف پر غور کرنا چاہیے۔ یہ لطف متضاد الفاظ و معانی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

''اللہ نے دن کام اور رات آرام، صبح جاگنے اور شام سونے کے لیے بنائی ہے۔''

دن۔ رات۔ صبح۔ شام۔ کام۔ آرام۔ سونا۔ جاگنا۔ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

ے سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں (اقبالؔ)

اس شعر میں سکون اور تغیر دو متضاد لفظ آئے ہیں اس لیے اس میں ''صنعتِ تضاد'' ہے۔

ے ایک سب آگ، ایک سب پانی دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں (میر تقی میرؔ)

۳ حُسنِ تَعلِیل

دنیا میں ہر بات کسی وجہ سے ہوتی اور ہر واقعے کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ کسی کو سبب معلوم ہوتا ہے لیکن بعض اوقات کوئی اصل سبب سے ناواقف ہوتا ہے اور از خود کسی چیز کو علّت (وجہ) قرار دے دیتا ہے۔ مثلاً شمع بجھ جائے تو دھواں اٹھنے کا اصل سبب نامکمل طور پر جلنا ہے مگر مرزا غالبؔ کے خیال میں اصل عِلّت اور بنیادی سبب کچھ اور ہے:

ے شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

میرے مرنے کے بعد ''شعلۂ عشق'' جو سرخ اور رنگین لباس پہنتا تھا، کالے کپڑے پہننے لگا آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہ معمولی بات ہے کہ شمع بجھ گئی لہٰذا دھواں چھا گیا۔ نہیں یہ اتنی سرسری بات نہیں ہے:

ے پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فُرات کی (میر انیسؔ)

ساحل سے موجوں کا ٹکرانا دیکھ کر انیس نے ایک عِلّت یا وجہ بیان کی کہ سپاہِ خدا یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ کے جاں نثار مجاہد تین دن سے پیاسے تھے۔ ان کے غم اور ان تک نہ پہنچنے کی شرم سے فرات کی موجیں ساحل سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ وہ شدتِ غم اور انتہائی مایوسی کے عالم میں تھیں۔ اس حسین اندازِ بیان اور اظہارِ خیال کو ''حُسنِ تعلیل'' کہتے ہیں۔

حُسنِ تعلیل کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے:

''کسی بات کی ایسی خوش نُما اور شاعرانہ وجہ بیان کرنا جو حقیقت میں اصلی وجہ نہ ہو۔''

؎ زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بکف　　　قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا!　(غالبؔ)

سائنس میں پھول کے زیرے کی زردی کا کوئی بھی سبب ہو‘شاعر کے خیال میں اس کی وجہ کچھ اور ہے۔قارون اپنے سونے کے خزانے سمیت زمین میں دھنس گیا تھا۔وہ سمجھتا تھا کہ دولت محفوظ رہی مگر ایسا نہ ہوا‘جو گلی زمیں سے ہو کر شاخ پر آتی ہے اس کی مٹھی میں سونا ہوتا ہے اور پھول وہ سونا ہتھیلی پر رکھ کر سب کو دکھاتا ہے۔

؎ سب کہاں ؟ کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں　(غالبؔ)

یعنی آپ جانتے ہیں کہ لالہ وگُل اور رنگارنگ پھولوں میں یہ حسن کہاں سے آیا؟ بات یہ ہے کہ سیکڑوں حسین چہرے قبر کے اندر اور زمیں کی تہ میں جا چکے ہیں‘ان چہروں میں سے تھوڑے سے چہروں کے جلوے ہیں جو لالہ وگل کی صورتوں میں آ گئے ہیں۔پھولوں کے حسن کو دفن شدہ حسین صورتوں کا پرتو بتانا حسنِ تعلیل ہے۔

۴ مراعاۃُ النَّظیر

’’نسیمِ سَحر کلیوں کو چھیڑتی‘ چڑیوں کو گدگداتی‘ ٹہنیوں کو ہلاتی‘ پتیوں کی تالیاں بجاتی چلی‘ کلیاں کھلیں‘ پھول مہکے‘ چڑیاں اڑیں‘ بلبل چہکی‘ فضا خوشبو اور طائروں کے نغموں سے بھر گئی۔‘‘

؎ یہ ہلال‘ آب ہے تیغِ خم دار کی　　　یہ ستارہ‘ چمک بختِ بیدار کی

تعریف: ’’ایک ہی مضمون سے تعلق رکھنے والے مناسب الفاظ کو سلیقے سے استعمال کیا جائے تو پڑھنے اور سننے میں عبارت اچھی لگتی ہے‘ اسے مراعاۃ النظیر کا نام دیا جاتا ہے۔‘‘ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

باغ کے تذکرے میں رَوَش‘ تختہ‘ سرو وچمن‘ گُل وبلبل‘ خار وخس‘ پھول اور کلی‘ سبزہ اور درخت آئیں تو اس صفت کو مراعاۃ النظیر کہیں گے۔

؎ رات چھٹکاتی ہے تارے‘ صبح برساتی ہے نور　　　موسمِ باراں بچھا دیتا ہے سبزہ دُور دُور

اس شعر میں رات‘ تارے‘ نور‘باراں‘ برساتی۔ایک ہی مضمون سے تعلق رکھنے والے الفاظ ہیں۔اس میں صنعتِ مراعاۃالنظیر مستعمل ہے۔

مراعاۃالنظیر کی تعریف یوں بھی کر سکتے ہیں:

’’کلام میں ایسے الفاظ کو جمع کرنا جن میں باہمی مماثلت اور مناسبت ہو‘تضاد نہ ہو‘ جیسے:

؎ رَو میں ہے رَخشِ عمر‘ کہاں دیکھیے تھمے　　　نے ہاتھ باگ پر ہے‘ نہ پا ہے رکاب میں

شعر کے تمام کلمات گھوڑے کے مناسبات سے تعلق رکھتے ہیں۔رَو‘ تھمنا‘ ہاتھ‘باگ‘ پا‘ رکاب۔